بادبان
مدیرِ اعزازی: ناصر بغدادی

سہ ماہی بادبان	اکتوبر تا دسمبر 2003ء	شمارہ نمبر۔9

مدیرِ اعزازی

ناصر بغدادی

مدیرِ انتظامی

عذرا قریشی

PRICE IN FOREIGN COUNTRIES: US $ 15/=
(By Registered Air Mail)

قیمت: 200/= (دو سو روپے)

کمپوزنگ: سسٹم گرافکس

پرنٹنگ: ذکی پرنٹرز، کراچی

بادبان میں شائع ہونے والی تحریروں اور ان کے تخلیق کاروں کے نقطہ نظر سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:

URDU QUARTERLY BADBAAN
E-2, 8/14, MAYMAR SQUARE, BLOCK. 14,
GULSHAN-E-IQBAL, KARACHI-75300(PAKISTAN)
Email:badbaanurdu@yahoo.com

علی احمد فاطمی

ممتاز شیریں......''اپنی نگریا'' سے ''میگھ ملہار'' تک

ممتاز شیریں اردو کی پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں جنہوں نے تخلیق و تنقید دونوں میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔ اس حیثیت وانفرادیت کے سلسلے میں محمد حسن عسکری نے ان کے متعلق لکھا ہے:

''ممتاز شیریں اردو کے ان چند لکھنے والوں اور لکھنے والیوں میں سے ایک ہیں جن کی تاریخ ہی ان کی شہرت سے شروع ہوتی ہے۔ انہیں مشہور ہونے کے لئے انتظار نہیں کرنا پڑا بلکہ پہلے ہی افسانے کے بعد انہوں نے ادب کے شائقین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ پھر جب ''نیا دور'' میں اردو افسانے کے متعلق ایک طویل مضمون شائع ہوا تو لوگ اور بھی چونکے۔ اردو میں یہ بالکل نئی بات تھی کہ ایک ادیبہ نہ صرف افسانے ہی اچھے لکھے بلکہ معقول قسم کی تنقید بھی لکھ سکتی ہو، خیر عورتوں کا ذکر ہی کیا ہے، عورتوں نے تو ابھی تک تنقید کی طرف زیادہ توجہ کی ہی نہیں خود مَردوں میں بھی جو لوگ تنقید لکھتے ہیں ان میں بھی چند ہی آدمی ایسے ہوں گے جن کا مطالعہ ممتاز شیریں کے برابر وسیع ہو۔''

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے لکھا ہے

"EVERY AGE WRITES ITS OWN CRITICSM":

یہی بات تخلیق کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے، ممتاز شیریں کی ادبی شخصیت کی مکمل تفہیم ان کے عہد اور حالات کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔ وہ ۱۲ر ستمبر ۱۹۲۴ء میں آندھرا پردیش کے قصبے ہندو پور میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد خاصے پڑھے لکھے انسان تھے۔ گھر میں علمی و ادبی ماحول تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اپنے نانا نانی کے پاس میسور چلی گئیں جنہوں نے ان کی پرورش کی۔ اپنی ابتدائی زندگی کے ماحول اور اثر کے بارے میں وہ خود لکھتی ہیں۔

''میری ابتدائی ذہنی اور ایک حد تک ادبی تربیت کے ذمہ دار ابا جان ہیں اور میری مذہبی اور اخلاقی تربیت نانا جان کے زیرِ سایہ ہوئی...... نانا ابا کی ثقافت، پاکیزگی اور پرہیزگاری، ابا جان کی وسیع المشربی، لبرل خیالات، آزاد اور بے فکر زندگی۔ عیش کوشی اور آرام طلبی۔ امّی کی سادگی، معصومیت، دنیا سے بے پروائی اور ناتجربہ کاری۔ صبر و قناعت اور گوشہ نشینی اور نانی اماں کا خُلق، ملنساری، ہر دل عزیزی، خوش اخلاقی اور نفاست، یہ سب متضاد اثرات اور خصوصیات غیر محسوس طور پر میرے کردار اور شخصیت میں گھلے ہوئے ہیں''

مہارانی کالج میسور سے بی۔اے کرنے کے بعد اگست ۴۲ء میں ان کی شادی صمد شاہین سے ہوگئی۔ تقریباً اسی زمانے میں ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے جس میں ان کی شادی اور صمد شاہین کی رفاقت اور ہم سفری کا بڑا دخل ہے۔ایک انٹرویو میں وہ خود کہتی ہیں:

''مجھے بچپن ہی سے ادبی چیزیں پڑھنے کا بہت شوق رہا ہے اور کافی چھوٹی عمر میں افسانے بھی لکھ لیا کرتی تھی لیکن اُس دور کو یقیناً میں اپنے دور میں شمار نہیں کروں گی۔صحیح معنوں میں ادبی ذوق کو تحریک ۱۹۴۲ء میں شادی کے بعد ہوئی چونکہ صمد شاہین خود ادبی ذوق رکھتے تھے اور اپنی لائبریری میں بھی زیادہ تر کتابیں تھیں اس لئے جب میں نے اچھے ادب کا مطالعہ شروع کیا اور میرے ادبی ذوق میں پختگی آئی تو پھر مجھے لکھنے کی تحریک ہوئی۔''

اور اس طرح ان کا پہلا افسانہ ''انگڑائی'' رسالہ ساقی میں ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔یہ وہ دور تھا جب عورتوں کے لئے لکھنا عیب تو نہیں لیکن تحریر میں بے باکی و تیزی و طرّاری کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔جاگیر دارانہ اور مردانہ سماج کے قہر و غضب سے عورت نکل نہیں سکی تھی۔پھر اس ماحول میں رشید جہاں، عصمت چغتائی، ممتاز شیریں وغیرہ نے اتنے اچھے، بے باک اور متخالف افسانے کیسے لکھے۔اس کے جواب میں ان کے خاندان کا پس منظر تو کام کر رہی رہا ہے، اس عہد کا سماجی اور سیاسی ماحول بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے۔جس کی کڑی در کڑی ممتاز شیریں ہیں۔

مسلم عورتوں میں پہلی بار جس خاتون نے اس حد کو توڑا اور روایت سے بغاوت کی وہ ڈاکٹر رشید جہاں تھیں جو شیخ عبداللہ کی بڑی بیٹی تھیں اور ایم بی۔بی ایس ڈاکٹر تھیں۔کیمونسٹ پارٹی کی سرگرم ممبر بھی اور ادیب و افسانہ نگار بھی۔اور انتہائی بے باک اور نڈر، اسی لئے ''انگارے'' کا قہر اور مسلم سماج کا عتاب سب سے زیادہ رشید جہاں پر اُترا۔انہوں نے مارکسزم کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔عالمگیر تبدیلیوں کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئیں۔گاندھی جی کے اصرار پر کھدر پہنا، جیل گئیں۔تخلیق کی سطح پر انہوں نے افسانے، ڈرامے، مضامین لکھے اور پہلی بار اپنے افسانوں میں قومی یک جہتی، طبقاتی ہم آہنگی اور مذہبی و اقتصادی استحصال کے خلاف خوب لکھا اور جم کر لکھا۔اور بقول قمر رئیس ''اب تک اردو افسانے میں جو ناگفتنی تھی رشید جہاں نے اسے گفتنی بنادیا۔''

عصمت چغتائی اپنے آپ میں ایک باب ہیں۔یہاں صرف اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ ان کے ذہن کی تخلیق میں جس طرح علی گڑھ کا ماحول۔اعلیٰ بی کی سرپرستی۔تحریک نسواں نے براہ راست اثر ڈالا۔عورتوں کے مسائل پر لکھنا تحریک نسواں کی دین ہے۔اس میں بے باکی اور حقیقت پسندی کا رنگ بھرنا رشید جہاں کی دین ہے اور افسانوں کی اس بھیڑ میں دو ہاتھ اور ہندوستان چھوڑ دو جیسے افسانے لکھنا ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ان سب عناصر کو ملا کر عصمت چغتائی کی شخصیت بنتی ہے جو ایک بڑے اور عہد ساز فنکار کی شخصیت ہے جس سے اردو افسانے میں بالعموم اور خواتین افسانہ نگاروں میں بالخصوص ایک نئے اور اہم باب کا اضافہ ہوتا ہے۔

اردو کی اہم اور منفرد افسانہ نگار اور ناقد ممتاز شیریں کو اس پس منظر اور روایت سے الگ کر کے نہیں

دیکھا جاسکتا۔ ان کا طریقہ کار منفرد اور جداگانہ تھا شاید اس لئے کہ ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا حالانکہ انہوں نے پڑھنا لکھنے کے بعد شروع کیا تھا جیسا کہ وہ خود لکھتی ہیں:

''میں نے پہلی افسانہ نگاری سے شروع کی تھی۔ اپنی نگریا کے افسانے اس وقت لکھے گئے جب میں ابھی باقاعدہ نقاد نہیں بنی تھی۔ یہ افسانے سب کے سب تقسیم سے پہلے سترہ سال سے اکیس سال کی عمر میں لکھے گئے اور جب میں نے اپنے پہلے تین افسانے انگڑائی، آئینہ اور گھنیری بدلیوں میں لکھے۔ میں نے ابھی تنقید نہیں لکھی تھی۔''

ممتاز شیریں نے کم عمری میں اس وقت لکھنا شروع کیا جب ان کے ذہن میں افسانے کا ناقدانہ تصور واضح نہ تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ رشید جہاں اور عصمت چغتائی کے افسانے اور مردوں میں محمد حسن عسکری، منٹو، ممتاز مفتی کے افسانے حرامجادی، آپا، چائے کی پیالی، پردے کے پیچھے جیسے افسانے ان کے ذہن میں افسانے کی فضا بنا چکے تھے۔ انگڑائی ان کا پہلا افسانہ ہے جو خاص و عام میں مقبول ہوا۔'انگڑائی' ان کی کچی عمر کے کومل ذہن کے اندرونی تقاضوں کے بنا پر ایک خاص ہیئت میں ڈھلا ہوا افسانہ ہے جو عام طور پر اس عمر کی مخصوص نفسیات ہوا کرتی ہے لیکن تہذیب و شرافت کا سنگِ گراں اسے پامال کر دیتا ہے لیکن شیریں نے ان بھاری پتھروں کو خواب میں اکھاڑ پھینکا اور خواب کی جزیات کو افسانہ نے کلیات میں ڈھال دیا اور خواب ایک خوبصورت حقیقت بن گیا۔ یہ افسانہ پورے طور پر ایک شادی شدہ لڑکی کی جنسی نفسیاتی کشمکش پر منحصر ہے۔ بہ ظاہر اس افسانے کی تصویر میں جنس کے رنگ و روغن نظر آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنسی میلان عام طور پر جسمانی گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ اس افسانے کا یہ میلان ایک جذباتی لگاؤ سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ یہ ایک کم سن لڑکی کی کہانی ہے جو بے حد ذہین، شوخ اور ہر دل عزیز ہونے کے باوجود ذہنی و جسمانی طور پر عدم تکمیلیت کا شکار ہے۔ ممتاز شیریں کا قلم ہم نفس و ہم جنسی کی ان تہوں تک پہنچ جاتا ہے جہاں عام آدمیوں کی نظر بھی نہیں پہنچ سکتی۔ گلنار نام کی اس کم سن دوشیزہ کردار کی معصوم محبت کے دروازے اپنی ہی ایک آئیڈیل خاتون ٹیچر کے لئے کھل جاتے ہیں لیکن پھر بھی ایک پیاس رہتی ہے۔ عجیب و غریب محبت کا روپ سامنے آتا ہے۔ جلد ہی گلنار کی شادی پرویز نامی خوبرو نوجوان سے ہو جاتی ہے اور اس کی محبت اچانک منقلب ہو کر پرویز کے لئے اُمڈ پڑتی ہے۔ یہ نازک اور انقلابی تبدیلی ہی اس افسانے کی جان ہے۔ پرویز شوہر ہے اور مرد ہے۔ محبت کا ایک فطری روپ۔ اور قدرت کا ایک بہت بڑا تحفہ۔ دیکھتے دیکھتے گلنار کی محبت گلابی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ لڑکی سے عورت ہونے کا وہ سنہرا انقلاب جو کسی مخالف جسم اور جنس کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ یہ افسانہ عورت کی نفسیاتی فطرت کی ایک دلنواز حقیقت ہی نہیں بلکہ زندگی کی ایک سچی اور زندہ تصویر ہے۔ عورت کا عورت سے پیار ایک ضمنی شے ہے ایک اخلاقی عمل، اس کی ایک دوسری نوعیت ہوتی ہے۔ عورت جتنا مرد کو ٹوٹ کر چاہتی ہے اپنی اس مخصوص چاہت کو وہ کسی عورت پر قربان کر ہی نہیں سکتی۔ یہ ایک ایسا نازک موڑ ہے جہاں رشتوں میں ایک انقلاب رونما ہوتا ہے اور سب بکھر جاتا ہے۔ اسی افسانے سے متعلق محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

''اس موضوع پر پہلا افسانہ ہے جو بغیر کسی جنسی چٹخارے اور سنسنی خیزی کے نفسیاتی نزاکت

اور فن کارانہ نفاست سے نبھایا گیا ہے۔ موضوع کے خطرے کے باوجود انگڑائی کی نزاکت اور معصومیت آخر تک برقرار رہتی ہے"

آئینہ ان کے ابتدائی افسانوں میں ایک اور اہم افسانہ ہے۔ انگڑائی میں احساسات شدید ہیں لیکن ان کا تعلق لمحاتی ہے۔ لڑکیوں کے اتفاقی نفس کے تعلق سے ایک شعلہ سا لپکتا ہے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد سرد پڑ جاتا ہے لیکن آئینہ اس کے برعکس دیرپا اثرات کا افسانہ ہے۔ انگڑائی ایک کم سن لڑکی کا افسانہ ہے اور آئینہ کا مرکزی کردار نانی بی بی ہیں جن کے کردار میں تہہ داری ہے۔ ممتاز شیریں نے نانی بی بی کے کردار کو بڑی محنت سے پیش کیا ہے لیکن اس سے ہٹ کر دیکھا جائے تو یہ ایک بوڑھی عورت ہے جو کہانی سنا رہی ہے لیکن سننے والی ایک کم عمر لڑکی ہے جو بڑی دلچسپی و ہمدردی سے اس کہانی کو سنتی ہے۔ اس طرح سے دو مختلف عمر کی نفسیات، تضادات سامنے آتے ہیں۔ وقت گزرتا ہے اور لڑکی نانی بی بی سے بے نیاز ہو کر شادی کے تصور میں گم ہو جاتی ہے ایسے میں اچانک اسے نانی بی بی کے انتقال کی خبر ملتی ہے۔ یہی افسانے کا اہم موڑ ہے اور یہی اس کا کلائمکس اور کہانی خوبصورت اور رنگین تصورات میں زندگی کی تلخ حقیقت کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔

ممتاز شیریں کے پہلے مجموعہ اپنی نگریا میں ان دو افسانوں کے علاوہ چار افسانے اور ہیں۔ گھنیری بدلیوں میں، اپنی نگریا، رانی اور شکست۔ گھنیری بدلیوں میں تکنیک کے اعتبار سے سب سے الگ افسانہ ہے۔ انگڑائی اور آئینہ کی طرح اس میں کسی لڑکی کا کردار نہیں بلکہ اس کے آگے کی منزل ہے یعنی ایک بے پناہ محبت کرنے والی بیوی کی داستان ہے جو ابھی نئی نئی ماں بنی ہے۔ اس کا شوہر بہت اچھے عہدے پر ہیں لیکن تنہائی کا غم اُسے کھائے جا رہا ہے۔ بیوی کی تڑپ، گھٹن اور بے تابی ہی اس افسانہ کے جوہر ہیں۔ جو کردار اس کو فت میں گھل رہا ہے۔ اس کے مکالموں کے ذریعہ کہانی کو پیش کر کے ممتاز شیریں نے اسی منفرد بنانے کی کوشش کی ہے۔

ہر چند کہ ممتاز شیریں نے ابتدا سے ہی اسلوب اور تکنیک کا خیال رکھتے ہوئے ایک جُداگانہ راہ اپنائی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جس دور میں انہوں نے ہوش و حواس کی آنکھیں کھولیں وہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا۔ یہ تحریک صرف اردو میں ہی نہیں بلکہ پورے عالمی ادب کو متاثر کر رہی تھی۔ ممتاز شیریں نے بھی اسے موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ رانی اور شکست جیسے افسانے تحریک کے زیر اثر لکھے گئے۔ شکست کا کردار فخرو چاچا ان کے تمام کرداروں سے بالکل مختلف ہے اور ان کا یہ واحد افسانہ ہے جس کا مرکزی کردار ایک مرد ہے جس کے ذریعہ ممتاز شیریں اپنے پورے تجربات و مشاہدات کو سمو دیتی ہیں۔ لیکن پھر بھی اس افسانے میں ان کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ جدید مزاج کے ناقد اس کا سبب ان کی غیر ضروری خارجیت، ساجیت یا بہ الفاظ دیگر ترقی پسندیدیت کو قرار دیتے ہیں لیکن یہ ادھوری سچائی ہے۔ ایک سچائی وہ ہے جس کا اعتراف وہ خود کرتی ہیں:

"ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے جانچتے ہوئے مجھے اپنے آپ سے سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ میرا مشاہدہ بہت محدود ہے۔ مجھے ادب کے مطالعہ کا بہت کچھ موقع ملا ہے لیکن زندگی کے مطالعہ کا بہت کم ہے۔ اسی لئے میرے افسانوں کا دائرہ بھی محدود ہے"

(میرے افسانے)

رانی افسانہ بھی کمزور ہو گیا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ رانی ممتاز شیریں کا کمزور ترین افسانہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ افسانہ ایک غریب مزدور عورت کے ارد گرد گھومتا ہے۔ راشن دکان کی ساری باتیں، ظلم و جبر کی داستانیں، پھر اسی بھیڑ بھاڑ میں چند ایسے موڑ بھی آتے ہیں جو دل آزار ضرور ہیں لیکن متاثر کن نہیں۔ یہ کہانی سیدھے سچے انداز میں آگے بڑھتی ہے اور سیدھے اور سیدھے سچے انداز میں کہانی کو لے کر چلنا ممتاز شیریں کو آتا ہی نہیں۔ وہ فن کی قائل ہیں۔ تکنیک پر نظر رکھتی ہیں۔ نفسیات پر یقین ہے۔ ہیئت و تکنیک، فکر و اسلوب باہم شیر و شکر ہوں ایسا وہ ضروری سمجھتی ہیں۔ اسی لئے وہ ان دونوں افسانوں کے بارے میں صاف لکھتی ہیں:

''اس مجموعے کے دو افسانے رانی اور شکست مندرجہ بالا افسانوں سے قطعی مختلف ہیں اور جن میں داخلی، باطنی حقیقت کے بجائے خارجی حقیقت اور واقعیت بڑی حد تک ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے گئے...... میں نے یہ بھی افسانے ہمدردی اور خلوص سے لکھے تھے۔ گو محض جذباتی خلوص اور ہمدردی کسی افسانے کو اچھا بنانے کے لئے کافی نہیں۔ چنانچہ رانی اور شکست کے بارے میں مجھے یہ قطعی دعویٰ نہیں کہ یہ اچھے افسانے ہیں''

(اپنی نگریا)

ان جملوں سے ایمانداری ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن ایک بات سمجھتے چلنے کی ہے کہ جس وقت ممتاز شیریں نے لکھنا شروع کیا ترقی پسند تحریک کا زور اور ترقی پسندی اس عہد کے افسانوں کا ایک اہم موضوع ہے۔ لیکن جب ممتاز شیریں نے تنقیدی مضامین لکھنے شروع کئے تو اس وقت ترقی پسند فکر کی مخالفت شروع ہو چکی تھی اور ممتاز شیریں بھی بہت جلد اس حصار سے نکل چکی تھیں لیکن سوال یہ ہے کہ رانی کی طرح آئینہ میں بھی ایک نچلے طبقہ کا کردار ہے اور ایک کامیاب کردار اور افسانہ ہے۔ پھر کیوں یہ افسانہ کامیاب ہوتا ہے اور رانی ناکام۔ ان افسانوں کی خالق ممتاز شیریں۔ وہ شیریں ہیں جنہوں نے اپنی کم عمری میں صرف مشاہدے کے آئینے میں جذبات میں ڈوب کر خلوص و ہمدردی کے ساتھ افسانے لکھے۔ اگرچہ اس میں ایک کچا پن ہے لیکن اس کچے پن میں بھی مہکتا ہوا آرٹ ہے کیونکہ جو نفسیات انہوں نے اپنے ان افسانوں میں پیش کی ہے وہ ایک زندہ اور بیدار نفسیات ہے۔ ان کے یہ جملے غور طلب ہیں:

''اپنی نگریا کے بیشتر افسانے ابتدائے بلوغیت کی تخلیق ہیں۔ چنانچہ انگڑائی، آئینہ اور گھنیری بدلیوں میں، یہ تینوں افسانے سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں لکھے گئے۔ اب اس سے اتنا آگے نکل آنے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو مجھے یہی احساس ہوتا ہے کہ شاید یہ افسانے اُسی دور میں لکھے جانے چاہیئے بھی تھے چنانچہ انگڑائی اگر میں اب لکھتی تو ممکن ہے کہ اس میں پختہ کاری ہوتی لیکن یقیناً وہ تازگی، شگفتگی وہ فطری بے ساختگی نہ آنے پاتی''

(میگھ ملہار)

ممتاز شیریں کی یہ باتیں بڑی حد تک مبنی برصداقت ہیں۔ اپنی نگریا اور میگھ ملہار کے درمیان ایک گیپ ہے۔ اس درمیان شیریں کے مطالعہ نے وسعت اختیار کی، ذہن بلوغیت و بصیرت سے پختہ تر ہوتا گیا اور

انہوں نے کچھ افسانے کے فن سے متعلق کچھ بہت اچھے غیر معمولی قسم کے مضامین لکھے جس نے پوری اردو دنیا کو چونکایا اور بقول محمد حسن عسکری کے انہوں نے اپنی تنقید کے ذریعہ نئے تجربوں اور اسلوبوں سے روشناس کرایا۔ یہ سب کچھ ایک طرف ہنگامہ خیز ضرور تھا لیکن تخلیق و تنقید کا بُعد و تضاد اپنے ساتھ ان افسانوں کی فطری تازگی و شادابی بھی لے گیا۔ اپنی نگریا کے افسانوں میں حُسن ہے۔ لطافت ہے فطری پن ہے اس کے برعکس میگھ ملہار کے افسانوں میں فکر ہے۔ فلسفہ ہے، سنجیدگی ہے اور کہیں کہیں خشکی بھی۔ اس کی سیدھی اور سچی مثال ان دونوں مجموعوں کے دیباچے ہیں، جو میگھ ملہار میں افسانوں سے پہلے ہے اور اپنی نگریا میں بعد میں۔ اپنی نگریا کا مضمون میرے افسانے سیدھا سادہ اور تخلیقی عمل میں ڈوبا ہوا ہے اور میگھ ملہار کا دیباچہ انتہائی فکر انگیز جو انگریزی اور فرانسیسی مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔

میگھ ملہار میں تین مختصر افسانے کفارہ، آندھی میں چراغ اور بھارت ناٹیہ ہیں اور تین طویل مختصر افسانے۔ آزاد نگارستان، دیپک راگ اور میگھ ملہار۔

خالق اپنی تخلیق کی قلب و جگر سے آبیاری کرتا ہے۔ کسی تخلیق میں خالق اور کبھی خالق میں تخلیقی عکس ابھرتا ہے۔ آندھی میں چراغ میں نیلا اور کفارہ میں درد سے تڑپنے والی ماں خود ممتاز شیریں بھی ہوسکتی ہیں اور کوئی دوسری ماں اور بیوی بھی۔ وہ المیہ جوان دونوں کہانیوں میں نظر آتا ہے وہ ممتاز شیریں کا بھی ہوسکتا ہے۔ ذرا ان جملوں کو دیکھئے:

> ''یہ المیہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جب میں خود ماں بنی تھی۔ ہسپتال کے ایک مستقل وارڈ میں بھی ایک دوسری ماں نے زندگی کی تخلیق نہیں کی تھی بلکہ ایک مُردہ بچے کو جنم دیا تھا اور خود موت سے ہمکنار ہوگئی تھی'' (میگھ ملہار ص ۲۶)

یہ بات بھی مانی جاسکتی ہے کہ یہ کہانیاں محض مشاہدے کی بنیاد پر گھڑی ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ کرب کے جن احساسات سے ان دونوں کہانیوں کے نسوانی کردار گزرتے ہیں اس کو ممتاز شیریں ہی محسوس کرسکتی تھیں، کوئی مرد نہیں۔ آندھی میں چراغ، رانی، اور شکست کی ترقی یافتہ شکل بھی کہی جاسکتی ہے کیونکہ اس میں نیلا کے شوہر امت کا کردار جو کلرک ہے جس کے بچے ہیں، بیمار بیوی ہے، پریشانی ہے۔ اس کا کردار بھی تخر و چاچا کے انداز سے اُبھر کر سامنے آتا ہے لیکن یہ کہانی کا ثانوی حصہ ہے۔

یہ دونوں کہانیاں فنی اعتبار سے کامیاب نہ سہی پر یہ ضرور ہے کہ اس میں ایک عورت کے شدید احساسات نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ ہندوستان میں ایک ایسی عورت کا کردار جو بقول ممتاز شیریں گہوارہ سے ڈولی اور ڈولی سے جنازہ تک کا سفر تیزی سے طے کرتی ہے۔ تہذیب، شرم و حجاب اور شوہر پرستی کے عناصر ذہن میں ایسا رچ بس جاتے ہیں کہ وہ اس سے آگے نکل ہی نہیں پاتی جس کی وجہ سے تیزی سے طے ہوتا ہوا اس کا یہ سفر مصائب سے پُر ہوجاتا ہے۔ کچھ مصائب تو فطرت نے اس کی ذات سے وابستہ کررکھے ہیں جس کا اشارہ کفارہ میں دیکھنے کو ملتا ہے، کچھ وہ اپنی معصومیت و مظلومیت اور اتھاہ محبت میں ڈوبے ہوئے نازک دل سے مجبور ہوکر غم کو نشاط میں تبدیل کرنے پر مجبور ہوتی رہتی ہے۔ اسی سے مشرقی عورت کا کردار بھی ابھرتا ہے جو ممتاز شیریں

کو بہت پسند ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں قنوطیت کے بجائے رجائیت کے پہلو زیادہ نظر آتے ہیں۔
ان کے یہاں ازدواجی گھٹن کے بجائے زندگی کا اثباتی نظریہ نظر آتا ہے۔وہ ترقی پسندوں پر معترض رہتی تھیں کہ وہ
ہمہ وقت زندگی اور معاشرہ کے کمزور ترین پہلو ہی پیش کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ "ادب پر یاسیت اور قنوطیت
چھاتی چلی جارہی ہے جو امید کا گلا گھونٹ رہی ہے اور انسانی کردار کے ہمیشہ تاریک پہلو پیش کرنے اور زیادہ اثر
پیدا کرنے سے اور برائیوں سے نفرت دلانے کے لئے اس تاریکی کو بہت ہی سیاہ رنگ دینے سے انسانی فطرت پر
سے بھروسہ اٹھ جانے کا اندیشہ ہے۔ہمیشہ اسی طرح کے افسانے پڑھتے پڑھتے یہ احساس ہونے لگتا ہے گویا
انسانیت دم توڑ چکی ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے اس خاص مقصد کو سامنے رکھ کر افسانے لکھے ہیں
بلکہ یہ کہ انہیں لکھتے وقت اس احساس کو بھی دخل تھا"

دیپک راگ مرد اور عورت کے مختلف رشتوں کی ایک دلچسپ کہانی ہے۔اس میں ایک طرف عزیز،
ممتاز، زبیری اور جارج جیسے متضاد مرد کردار سامنے آتے ہیں تو دوسری طرف ڈوروتی، کملا، چمپا، کسم، جمیلہ، پرمیلا
جیسی لڑکیوں کے کردار سامنے آتے ہیں جو ایک دوسرے سے گہری مماثلت رکھتے ہیں۔ان کرداروں کے ذریعہ
جنسی رشتوں کا پتہ چلتا ہے لیکن ان رشتوں میں محض جنسی لذت نہیں بلکہ ممتاز شیریں کی اپنی فکر اور تجربے اور زبان
کے ایسے خوب صورت نمونے چھوڑے ہیں جو افسانے کو ایک خوب صورت افسانہ بنانے میں پوری مدد کرتے
ہیں۔مثلاً یہ جملے دیکھئے:

"تم سمجھتے ہو کہ ایسے آدمیوں کو سچی مسرّت ملتی ہے۔ایک عارضی لذّت، سطحی مسرّت، اور
سچی دلی مسرت میں بہت فرق ہے اور پھر وہ کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ایک گناہ سے دوسرے گناہ
کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں لیکن ان کی پیاس کبھی نہیں بجھتی، تشنگی بڑھتی چلی جاتی ہے اور یہ
تشنگی ان کی روح پر چھا جاتی ہے۔"

اور اب ذرا یہ جملے بھی ملاحظہ کیجئے جس میں ایک شادی شدہ عورت کے حسن کو بیان کیا گیا ہے

"شادی شدہ لڑکیوں کو پھانستا تو اور بھی آسان ہے اور شادی شدہ عورتیں تو جسمانی طور پر اور بھی
زیادہ کشش انگیز ہوتی ہیں......صحت مند اور نارمل جنسی زندگی ان کے چہروں پر نکھار پیدا کر دیتی
ہے۔وہ زیادہ کشش کی حامل بھی ہوتی ہیں اور انہیں پھانستا بھی زیادہ آسان ہے۔ایک تو یہ جنسی
زندگی کی عادی ہوتی ہیں پھر انہیں ایسے شوہر ملے ہوں اور یہ تشنہ ہوں تو کیا کہنے اور سب سے بڑی
بات یہ کہ انہیں بچے کا ڈر نہیں ہوتا"

اس کے علاوہ ایک کچی عمر کے حُسن کی یہ تصویر ملاحظہ ہو:

"اس عمر کی لڑکیوں کی اٹھان عجیب ہوتی ہے۔اس عمر کی لڑکیاں پکا نرم پھل نہیں ہوتیں بلکہ چٹپٹی،
ترش، کچی کیری کی سی اور تازہ کچی کیری کو دیکھ کر رال ٹپک پڑتی ہے نا؟......اس عمر میں ان کی
جنسی حس ابھی ابھی جاگی ہوتی ہے اور جنس سے متعلق ان کا جذبۂ تجسس اس قدر بڑھا ہوتا ہے۔"

یہ جملے محض جنسی لذتیت پر مبنی نہیں بلکہ دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں کیوں کہ یہ جملے کہانی کے دو کرداروں

کے درمیان ہونے والی جنسی بحث کے دوران اٹھتے ہیں اور زندگی کے بعض دیگر حقائق کی طرح اس نازک موضوع پر بھی کھل کر باتیں ہوتی ہیں اور پردے اُٹھتے ہیں۔ اس افسانے کو سجانے میں ممتاز شیریں کی ذہانت کا قائل ہونا پڑتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی زبان دانی کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

ممتاز شیریں کے قلم سے نکلے ہوئے یہ جملے کیا اس سے قبل کسی خاتون افسانہ نگار کے یہاں نظر آتے ہیں۔ اس میں رشید جہاں اور عصمت نے بھی اپنے قلم اور موضوع کے ساتھ نہایت بے باکانہ انداز اختیار کیا لیکن عصمت کے یہاں بالخصوص زبان کا چٹخارہ اکثر موضوع کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ ان کے یہاں گھریلو زبان کا مزہ زیادہ ہے اسی گھریلو زبان میں انہوں نے شعلے بھی لپکائے ہیں. بجلیاں بھی گرائی ہیں لیکن شوخ اور بے باک زبان کے باوجود ان کی ایک حد ہے لیکن ممتاز شیریں نے جنس جیسے نازک موضوع پر قلم اٹھا کر مرد اور عورت کے جنسی رشتوں پر ذکر کر کے کچھ ایسی دانشوری، کچھ ایسا اسلوب اختیار کیا کہ تلذذ کے ساتھ ساتھ صداقت اور حقیقت باہم مدغم ہو جاتے ہیں بقول محمد حسن عسکری:

''دیپک راگ کا نئی اہم اور نیا تجربہ ہے اور یہ تجربہ محض تکنیکی تجربہ نہیں ہے''

دیپک راگ جنس کی آڑ میں ایک سماجی مسئلہ بن کر سامنے آتا ہے، وہ سماجی مسئلہ جو عورت اور مرد کے درمیان اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ پاسٹرنک نے ڈاکٹر زدوگو میں کہا ''فن موت پر فتح پانے کی ایک کوشش ہے'' اس جملے پر میگھ ملہار کی بنیاد پڑی۔ بقول شیریں:

> ''اس میں کوئی سماجی مسئلہ نہیں بلکہ موت و حیات اور ابدیت کا مسئلہ ہے۔ میگھ ملہار کا مرکزی موضوع فن کار کی حیات جاوداں، فن کار وہ امر موجود ہے جو جسمانی موت کے بعد اس کے فن میں زندہ رہتا ہے''

اس کہانی میں موسیقی کے فن کے سہارے اس ک[illegible]ٹ کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فن ہی ایک ایسی شے ہے جس کی قدیمی جڑیں مختلف [illegible] ملک کی تہذیبوں میں ہزار اختلافات ہونے کے باوجود ایک پاتال میں پیوست نظر آتی ہیں۔ ہر ملک کے قدیم رومانی قصے ایک دوسرے سے حیرت انگیز طور پر مماثلت رکھتے ہیں اور اس مقام پر فن کے سارے رشتے صدہا انتشار کے باوجود ایک مقام پر وحدت اختیار کر لیتے ہیں اور یہیں یہ افسانہ دیپک راگ کے موضوع سے اک دم الگ ہو جاتا ہے۔ دیپک راگ میں ایک ہی بات کو مختلف شکل میں پیش کیا گیا ہے لیکن میگھ ملہار میں مختلف شکلیں سمٹ کر اکائی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

یہ کہانی موسیقی اور موسیقار کی مختلف شکلوں کو سمیٹتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ اس کا پہلا حصہ نیل کمل اس کہانی کا ہر اعتبار سے خوب صورت ترین حصہ ہے۔ دوسرا حصہ سرسوتی میں دلکشی قائم رہتی ہے لیکن افسانہ جوں جوں آگے بڑھتا ہے فکر کی جڑیں طویل ہوتی جاتی ہیں لیکن کہانی بوجھل ہوتی جاتی ہے اور یہ صاف محسوس ہونے لگتا ہے کہ شیریں کا قلم جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا ان کی توجہ آرٹ کی دلکشی پر کم فکر اور فلسفہ کی گہرائی پر زیادہ ہوتی گئی۔

شیریں کے اس افسانے پر ان کے شوہر صمد شاہین نے اچھی بات کہی ہے:

''وہ جو ابتدا میں ایک حسین فنکارانہ چیز تھی، آگے چل کر ایک بوجھل اینلکچویل تخلیق بن گئی کیوں کہ جب تمہیں مختلف تہذیبوں کی دیو مالاؤں کو یکجا کرنے اور ان کی مشترکہ خصوصیات اور مناسبت ثابت کرنے کی سوجھی تو تمہارے اندر کے فن کار پر تمہاری وہ دوسری ہستی جو انٹلکچویل اور نقاد کی تھی حاوی ہوتی چلی گئی چنانچہ تیسرا حصہ عملی اور بوجھل بن گیا اور چوتھا حصہ بے جان''

(دیباچہ میگھ ملہار)

اس کے جواب میں ممتاز شیریں نے لکھا:

''اس افسانہ میں میں نے صرف ایک طرح سے مختلف ملکوں اور تہذیبوں کی اساطیر کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور ان میں ان ہی کے اندر چھپی ہوئی، گہری معنویت اُجاگر کی ہے۔ اساطیر اور دیومالاؤں سے مجھے ہمیشہ بڑی دلچسپی رہی ہے۔ میں نے انہیں شوق سے پڑھا اور محسوس کیا، کہ یہ محض فرضی گھڑے ہوئے قصے نہیں ہیں۔ اُن میں کسی نہ کسی گہری حقیقت کو حسین، شاعرانہ مجازی لباس پہنایا گیا ہے...... بہر حال میں نے میگھ ملہار میں کئی طرح کے تجربے کئے ہیں۔ اب یہ نہیں معلوم کہ یہ افسانہ کہاں تک تجربہ کی حد سے آگے بڑھ کر تخلیق بنا ہے''

(دیباچہ میگھ ملہار)

ممتاز شیریں کی یہ کہانی ان کی ذاتی آسودگی کے لئے لکھی گئی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر قاری اس سے آسودہ ہو سکے۔ چونکہ اس کہانی کے پس منظر میں مختلف ممالک کی تہذیبی داستانیں پوشیدہ ہیں اور اس کی روح میں قدیم موسیقی کے عناصر پیوست ہیں لہذا جب تک کہ قاری ان سب اشیاء سے کم سے کم واقفیت نہ رکھے وہ کہانی کے صرف ظاہری حسن سے متاثر ہو سکتا ہے۔ باطن تک اس کی رسائی ناممکن ہے اور یہیں سے یہ کہانی بہ ظاہر تو نیچے سے اٹھ کر بلندی پر چلی جاتی ہے لیکن اس بلندی کے وہی لوگ قائل ہوں گے جن کا قول ہے کہ کہانی عام قاری کے لئے نہیں لکھی جاتی۔ کہانی کو سمجھنا ہے تو شعور کو بیدار اور ساکت و جامد عقل و فہم میں جذبۂ تحریک پیدا کرنا پڑے گا اور عوام سے اٹھ کر خواص کی صف میں آنا پڑے گا۔ ممتاز شیریں کی یہ کہانی ایسی کہانیوں کا پیش خیمہ ضرور بن جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعد کی کہانی نے اُن سے انتشار آمیز فکر ضرور لے لیا لیکن اس کا حُسن نہ لے سکی اور وہ اپنی اس کمزوری کی وجہ سے لاشعوری طور پر کچھ دیر کے لئے بدصورتی و بدہیئتی کی طرف مڑ گئی۔ فکر و فلسفہ کی تمام رگیں جھنجھوڑ دیجئے اور تخلیق پر سے تمام پابندیاں ہٹا دیجئے لیکن اتنی بات طے ہے کہ تخلیق نام ہے فن کا، حُسن کا، جمالیاتی احساس کا، خشک سے خشک فلسفہ فن کے نرم اور کومل سانچے میں زیادہ نکھرتا ہے۔ سخت، جارح، اور اُلجھے ہوئے سانچے میں نہیں۔ ممتاز شیریں کے ابتدائی افسانوں میں جو نرمی، کوملتا اور حُسن نظر آتا ہے وہ اس بات کی مثال ہے۔ جو حُسن اپنی نگریا کے افسانوں میں ہے وہ میگھ ملہار کے افسانوں میں نہیں۔ غور و فکر کا جو معیار اور تنوع اور تکنیک کے جو تجربے میگھ ملہار میں نظر آتے ہیں وہ اپنی نگریا میں نہیں۔ اس کی سیدھی سی مثال ان کے دو افسانے ہیں۔ دیپک راگ ان کا وہ افسانہ ہے جو اس عمر میں ہی لکھا جا سکتا تھا۔ اس میں جنس،، گناہ، اور عقل کی وہ پرتیں

ہیں جو اپنی نگریا کے کسی افسانے میں نظر نہیں آتیں اور یہ ممکن بھی نہ تھا کیونکہ جن دنوں وہ اپنی نگریا کے افسانے لکھ رہی تھیں اُن دنوں شیریں نہ تو گناہ کی لذت سے واقف تھیں اور نہ ہی ایسے باریک موضوعات پر انہیں گرفت تھی۔ اس کچی عمر میں شیریں اپنے مزاج، نفسیات اور وقت کے تقاضے کے اعتبار سے ہی موضوعات کا انتخاب کر سکتی تھیں اور اسی وجہ سے ان کے افسانے جنسی لذت، مرد و عورت کے رشتوں کی نزاکت کی وہ شکلیں ہیں جو کم عمری اور نا تجربہ کاری کے دور میں سوچی سمجھی جا سکتی ہیں۔ یہی شکلیں آگے چل کر دوسری صورتیں اختیار کر لیتی ہیں جیسا کہ میگھ ملہار کے افسانوں سے پتہ چلتا ہے۔

یہ ایک طرح سے ممتاز شیریں کے فن کی ارتقائی منزلیں ہیں جسے انہوں نے بڑے سلیقہ سے طے کیا ہے۔ ممتاز شیریں کی تنقیدی صلاحیت نے ان کے افسانوی حُسن کو سنوارا اور پختہ کیا اور اس قدر کہ باوجود اس کے انہوں نے کم افسانے لکھے لیکن اردو افسانے کی کوئی بھی تاریخ ممتاز شیریں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکے گی۔